© rasailojaraid.com

محسن فارانی

قسط:1

لغزشیں اہل صحافت کی!

① آغاز کرتے ہیں ہم لفظ 'عوام' سے؛ عہدِ شاہ جہانی سے جب ریختہ میں، جو اُردوے معلّیٰ (اعلیٰ لشکر یعنی 'شاہی فوج' میں بولی جانے کے باعث 'اُردو' زبان کہلائی، لفظ 'عوام' جمع مذکر تھا، یعنی "عوام سمجھتے ہیں۔"، "عوام یہ کہتے ہیں۔" جیسے جملے عام تھے۔ یوں ساڑھے تین سو برس لفظ عوام مذکر بولا جاتا رہا۔ ویسے بھی فرمودۂ ربانی ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ کی رعایت سے اور برصغیر کی آبادی میں ۵۰ فیصد سے زیادہ مرد ہونے کے باعث لفظ 'عوام' مؤنث ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ لیکن بُرا ہو منہ زور چینلوں کے زیرِ اثر نسوانیت آمیز صحافت کا، گزشتہ دو تین دہائیوں کے اندر اچھے بھلے مذکر 'عوام' کو مونث بنا دیا گیا ہے۔ یہ کیونکر ہوا...؟

ہوا یوں کہ محترمہ بے نظیر بھٹو جو سیاست میں بڑے بڑے جغادری مردوں کے کان کاٹتی تھیں، ۱۹۸۸ء میں برسرِ اقتدار آئیں تو میڈیا والے اُن کی زبان سے نکلے ہوئے ہر حرف کو مِن وعَن لکھنے، دکھانے اور سُنوانے لگے۔ اب محترمہ ٹھہریں خالص انگلش میڈم، وہ سوچتی انگریزی میں تھیں اور پھر ذہن میں اس کا ترجمہ کر کے اُردو میں تقریر فرماتی تھیں۔ چونکہ انگریزی لفظ 'پبلک' ہمارے ہاں بطور مؤنث مستعمل ہے، سو محترمہ نے اسی مفہوم میں 'عوام' کو بھی واحد مؤنث بنا دیا۔ وہ کہتی تھیں: "عوام سمجھتی ہے، عوام بولتی ہے۔" اور میڈیا بالخصوص ٹی وی نے محترمہ کے اس نوع کے جملے اخباری صفحات اور ہوا کے دوش پر اس قدر اُچھالے کہ آج ہر کوئی بے نظیر تانیثی لہجے میں 'عوام' کی درگت بنا رہا ہے۔ بیشتر صحافیوں کی مردانہ غیرت جانے کہاں سو گئی۔ اچھے خاصے پڑھے لکھے بھی 'عوام' کے سلسلے میں نسوانی آہنگ میں بہے چلے جا رہے ہیں۔ رہے نوخیز صحافی اور اینکر تو ان کی تو تربیت ہی 'بے نظیر' دور میں ہوئی ہے۔ ع خامہ انگشت بدنداں ہے 'انھیں' کیا لکھیے!

② ایک چینل پر کسی محترمہ نے لفظ 'خودکشی' کہا تو ہمارے کان کھڑے ہوئے کہ لفظوں کی ساخت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تلفظ کا شعور اب اس قدر مِٹ گیا ہے! 'خود کُشی' فارسی مصدر کُشتن (قتل کرنا، مارنا) سے ہے، نہ کہ کشیدن (کھینچنا) سے۔ ذرا ان کی مثالیں دیکھیے:

کُشتن (مارنا) سے: برادر کُشی (بھائی کو قتل کرنا)، خود کُشی (اپنے آپ کو قتل کرنا)، جراثیم کُشی (جراثیم کو مارنا)، نفس کُشی (پرہیز گاری)، ان سے اسم فاعل برادر کُش، خود کُش، جراثیم کُش وغیرہ ہیں۔ یوں چینلوں کے حضرات وخواتین کو 'خود کُش دھماکا' کہنا چاہیے، نہ کہ 'خود کَش دھماکا'۔

کَشیدَن (کھینچنا) سے: دل کشی، نقشہ کشی، سر کشی (بغاوت)، جاروب کشی (جھاڑو دینا)، رسّہ کشی، بُزکشی (بُز: بھیڑ بکری)، وسطی ایشیا کے اس کھیل میں ماہر گھڑ سوار نیزے سے بھیڑ بکری کی لاش اُچک لے جاتے ہیں۔ ان تراکیب کے اسم فاعل دل کش، سر کش، جاروب کش وغیرہ ہیں۔

③ اخبارات وجرائد میں اب ایک نئے مرکب سے واسطہ پڑ رہا ہے اور وہ ہے: 'پیشن گوئی' جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں۔ فارسی الفاظ 'پیش' یا 'پیشین' دونوں کے معنی ہیں: 'پہلے' یا 'آگے'۔ ان سے درست ترکیب 'پیش گوئی' یا 'پیشین گوئی' ہے، یعنی 'مستقبل کی کوئی بات کہنا' جسے انگریزی میں Prophecy کہا جاتا ہے۔ لیکن یار لوگوں (کمپوزروں سے معذرت کے ساتھ) نے ایک تیسری ترکیب گھڑلی ہے، یعنی پنجابی کے لفظ 'ٹیشن' (Station) کے وزن پر لفظ 'پیشن' ایجاد کر لیا ہے جو لغت میں سراسر 'بدعت' ہے۔ اس سے احتراز کرنا چاہیے!!

④ چِیں بجبیں ہونا: فارسی میں 'چِین' کا مطلب ہے تیوری اور 'جبیں' ماتھے کو کہتے ہیں۔ گویا 'چیں بجبیں ہونا' کے معنی ہیں: "ماتھے پر تیوری چڑھانا" لیکن اخبارات میں "چیں بجبیں" کے بجائے "چیں بچیں" لکھا جا رہا ہے جو کسی طرح درست نہیں۔ "چیں بجبیں" کے حوالے سے شاعر نے "چینِ جبیں" (ماتھے کی تیوری) کی ترکیب استعمال کی ہے

جھڑکی سہی، ادا سہی، چینِ جبیں سہی
لیکن نہیں سہی اگر تو اک 'نہیں' سہی

وصل کے سوال پر محبوب کی 'نہیں' برداشت نہ کرنا تو شاعر کا معاملہ تھا، ہم تو اہل صحافت اور ٹی وی والوں سے صرف یہ کہتے ہیں کہ 'چیں بچیں' کی بے ڈھب ترکیب چھوڑ کر درست ترکیب 'چیں بجبیں' لکھیے اور بولیے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

۵ شاعر کا ذکر آیا تو فارسی کے عظیم شاعر مصلح الدین سعدی شیرازی کے حوالے سے ایک مصرع دیکھیے: ع سعدی کہ گوئے بلاغت ربُود

"سعدی بلاغت کی گیند چھین لے گیا۔"

کاتب نے مصرع کی کتابت کرتے وقت 'بلاغت ربود' کو جوڑ کر 'بلاغتربود' لکھ دیا جس سے مصرع بے معنیٰ اور ناقابلِ فہم ہو گیا۔ اس سے فارسی کا محاورہ 'غتربود شُدن' یا کردن اور اُردو محاورہ 'غتربود ہونا یا کرنا' وجود میں آیا جس کے معنی ہیں: "گڈمڈ ہونا یا خراب کر دینا"

۶ ہمارے ایک بہت مشہور کالم نگار اور اینکر جاوید چودھری ہیں۔ اپنے ایک کالم میں انھوں نے لکھ ڈالا: "ہم (مسلمان) ایک ہزار سال سے آکسفورڈ اور کیمبرج کے مرہون منّت ہیں۔" ان کا یہ جملہ مبالغے اور خلافِ حقیقت بات کا امتزاج ہے۔ اوّل تو ۱۰۰۰ سال پہلے آکسفورڈ اور کیمبرج کا وجود ہی نہیں تھا، البتہ اس وقت اسلامی یونیورسٹیاں جامعہ قرویّین (فاس، مراکش، تاسیس ۸۵۹ء) اور جامعہ ازہر (قاہرہ، ۹۷۱ء) موجود تھیں۔ آکسفورڈ یونیورسٹی ۱۱۶۷ء میں قائم ہوئی اور کیمبرج ۱۲۳۰ء میں وجود میں آئی۔ گویا ۱۰۰۰ سال پہلے سے مسلمانوں کے آکسفورڈ اور کیمبرج کے مرہونِ منّت ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا بلکہ اس زمانے میں تو یورپ سے علم کے متلاشی فاس، قاہرہ اور قرطبہ آکر اسلامی جامعات کے مرہونِ منّت ہوتے تھے۔ مشرق کے مسلمان اگر آکسفورڈ اور کیمبرج کے مرہونِ منّت ہوئے ہیں تو گزشتہ ڈیڑھ دو سو برس میں ہوئے ہیں جب مسلمان اِدبار کی حالت کو پہنچے اور اہلِ یورپ سائنسی ترقی کی منزلیں طے کرنے لگے تھے۔

۷ محترمہ نازیہ مصطفیٰ نوائے وقت کی کالم نگار ہیں۔ تاریخ کا اچھا خاصا مطالعہ ہے مگر ان کا علم جغرافیہ ذرا کمزور ہے۔ گزشتہ ماہ اپریل میں چین کے صدر پاکستان تشریف لائے تو محترمہ نے چین پر اپنے کالم میں چین کے دریاؤں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ وہ سب بحر اوقیانوس میں گرتے ہیں۔ اب کہاں مغربی سمندر بحر اوقیانوس جو یورپ، افریقہ اور امریکہ کے درمیان واقع ہے اور کہاں مشرقی ملک چین، جسے بحیرۂ زرد اور بحیرۂ چین مشرقی کے ساحل لگتے ہیں جو کہ دنیا کے سب سے بڑے سمندر بحر الکاہل کا حصہ ہیں، لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ چین کے دریا بحر الکاہل میں گرتے ہیں (نہ کہ بحر اوقیانوس میں)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دراصل اُردو صحافیوں کو اکثر دنیا کے دو بڑے سمندروں بحر الکاہل (Pacific Ocean) اور بحر اوقیانوس (Atlantic Ocean) میں اشتباہ ہو جاتا ہے کیونکہ ہمارے سکولوں میں جغرافیہ بطورِ مضمون نہیں پڑھایا جاتا اور طلبہ کے ذہنوں میں سکول ہی سے ملکوں اور سمندروں وغیرہ کا محل وقوع راسخ نہیں ہو پاتا۔ ادھر صحافت اور میڈیا پر انگریزی کا غلبہ ہے۔ انگریزی خبروں میں جب Atlantic اور Pacific کے نام آتے ہیں تو کئی مترجم اور قلم کار سمجھ نہیں پاتے کہ ان کے درست اُردو نام کیا ہیں اور وہ بعض اوقات حامد کی ٹوپی محمود کے سر رکھ دیتے ہیں جیسا کہ محترمہ نازیہ مصطفیٰ نے کیا۔ Atlantic (بحر اوقیانوس) کے مشرق میں یورپ اور افریقہ ہیں اور مغرب میں براعظم شمالی امریکہ، جزائر غرب الہند (ویسٹ انڈیز) اور براعظم جنوبی امریکہ ہیں جبکہ Pacific (بحر الکاہل) کے مشرق میں براعظم شمالی و جنوبی امریکہ ہیں اور مغرب میں براعظم ایشیا، جزائر شرق الہند (ایسٹ انڈیز یعنی انڈونیشیا، فلپائن وغیرہ) اور آسٹریلیا واقع ہیں۔

بحر الکاہل یا Pacific Ocean کا نام ہی منفرد ہے۔ کاہل (Pacific) یعنی سست کیونکہ اس میں بحر اوقیانوس اور بحر ہند کی نسبت کم شدّت کے طوفان اُٹھتے ہیں۔ رہا اوقیانوس، تو اسے یہ نام (Okeanus) یونانیوں (بطلیموس وغیرہ) نے دیا تھا جسے عربوں نے معرّب کر کے اوقیانوس بنا لیا۔ عربی اور فارسی سے یہ نام اُردو میں آیا۔ اب لطیفہ یہ ہوا کہ 'اوقیانوس' اسم معرفہ تھا مگر یورپ والوں نے اسے نکرہ بنا کر Ocean (بڑا سمندر) کے ساتھ معرفہ Atlantic لگا لیا اور عربوں نے اُن کی پیروی اور تعریب کرتے ہوئے اسے المحيط الأطلنطي کہنا شروع کر دیا جبکہ ہم بدستور عربوں کے دیے ہوئے 'اوقیانوس' سے چمٹے ہوئے ہیں، گویا ؏ ہم ہوئے کافر تو وہ کافر مسلماں ہو گیا!

خیر کوئی بات نہیں، میاں شہباز شریف کی پہلی جماعت سے انگلش میڈیم مسلط کرنے کی پالیسی کے تحت جلد وہ وقت آنے والا ہے جب یہاں بھی بچہ بچہ 'اوقیانوس' کے بجائے 'اٹلانٹک' پکارے گا۔ (اللہ کرے وہ وقت نہ آئے کہ پھر انگریزی کے ساتھ موسیٰ، اسحٰق، یعقوب اور یوسف کے بجائے موسز، آئزک، جیکب اور جوزف جیسے نام بھی چلے آئیں گے۔)

اب ذرا اُردو، عربی اور انگریزی کے متبادل بعض جغرافیائی نام دیکھیے:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انگریزی	عربی	اردو
Pacific Ocean	المحيط الهادي	بحرالکاہل
Atlantic Ocean	المحيط الأطلنطي	بحراوقیانوس
Ocean	محيط	بحر (بڑاسمندر)
Sea	بحر	بُحیرہ (چھوٹاسمندر)
Lake	بُحيرة	جھیل
River	نهر، وادي	دریا
Canal	قناة، ترعة	نہر

دلچسپ بات یہ ہے کہ ہم جسے 'دریا' کہتے ہیں، فارسی میں اسے 'رُود' کہا جاتا ہے جبکہ فارسی بان (فارسی والے) سمندر کو 'دریا' کہتے ہیں، مثلاً 'دریاے ہند' یعنی 'بحر ہند'۔ ہم نے یہ بحر ہند (Indian Ocean) بھی عربوں کے البحر الهندي سے لیا تھا مگر اب عرب اسے المحيط الهندي کہتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اسی لیے 'محیطِ بیکراں' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

ستم یہ ہے کہ ہم نے بحر، بحیرہ اور نہر کے الفاظ عربوں سے لیے مگر عربوں نے اب اُن کے معنی ہی بدل ڈالے ہیں۔ ادھر ہمارے ٹی وی چینلوں پر بُحيرة کو غلط طور پر بَحيرة پڑھا جاتا ہے جبکہ قرآنی لفظ بَحيرة کے معنی ہیں "کسی بُت کے نام وقف کی گئی اونٹنی۔"

⑧ قارئین کے لیے جغرافیہ ذرا گاڑھا ہو گیا ہے، اس لیے پھر ہم تاریخ کی بات کرتے ہیں۔ عثمانی سلطنت و خلافت (۱۲۹۹ء تا ۱۹۲۴ء) تاریخ اسلام کی طویل ترین اور عظیم ترین سلطنت تھی۔ اس کے آخری خلیفہ کا نام اکثر قلم کار سلطان عبدالحمید ثانی لکھ دیتے ہیں جبکہ آخری خلیفہ اور سلطان دراصل عبدالمجید ثانی تھے۔ آخری چار عثمانی خلفا کے ادوار کی تحدید سے بات واضح ہو جائے گی:

خلیفہ عبدالحمید ثانی:	۱۸۷۶ء سے	۱۹۰۹ء تک
خلیفہ محمد خامس:	۱۹۰۹ء سے	۱۹۱۸ء تک
خلیفہ محمد سادس:	۱۹۱۸ء سے	۱۹۲۲ء تک
خلیفہ عبدالمجید ثانی:	۱۹۲۲ء سے	۱۹۲۴ء تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خلیفہ عبدالحمید ثانی نے یہودی لیڈروں کی یہ پیشکش مسترد کر دی تھی کہ اگر فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنا دیا جائے تو وہ سلطنتِ عثمانیہ کے تمام قرضے ادا کر دیں گے۔ اس انکار کی پاداش میں یہودیوں کے آلۂ کار 'ینگ ٹرکس' (نوجواں ترکوں) نے خلیفہ عبدالحمید ثانی کو خلافت سے دستبرداری پر مجبور کر دیا تھا۔ رہے آخری عثمانی خلیفہ عبدالمجید ثانی تو وہ تو فوجی آمر مصطفیٰ کمال پاشا (اتاترک) کے دست نگر تھے جس نے سلطنت اور خلافت ختم کر کے خلیفہ کو جلاوطن کر دیا اور ننانوے فیصد مسلم اکثریت کے ملک میں سیکولرزم کا جھنڈا گاڑ دیا جسے اب جناب رجب طیب اُردوان اُتارنے میں کوشاں ہیں۔

⑨ ایسا ہی معاملہ بغداد کے آخری عباسی خلیفہ مستعصم باللہ (۱۲۳۷ء تا ۱۲۵۸ء) کا ہے جسے بالعموم 'معتصم باللہ' لکھ دیا جاتا ہے۔ معتصم باللہ (۸۳۳ء تا ۸۴۲ء) جو خلیفہ ہارون الرشید کا چھوٹا بیٹا تھا اور اپنے بھائی مامون الرشید کے بعد تختِ خلافت پر بیٹھا، اس نے محمد بن قاسم کی طرح ایک مسلمان خاتون کی فریاد "وا معتصما" (یعنی اے معتصم! تم کہاں ہو؟) پر یلغار کی اور اسے رومیوں کی قید سے رہائی دلا کر قیصر کے شہر عموریہ (ترکی) کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ لیکن صحافی حضرات وخواتین ۴ صدیوں کا زمانی بُعد بیک جنبش قلم ختم کر کے بغداد کی تباہی (۱۲۵۸ء) کے وقت عباسی تختِ خلافت پر معتصم باللہ کو بٹھا دیتے ہیں، حالانکہ حملۂ ہلاکو خان کے وقت خلیفہ مستعصم باللہ تھا جس کی خلافت کا مرثیہ سعدی شیرازی نے یوں پڑھا

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں　　　بر زوالِ مُلکِ مستعصم امیر المؤمنیں

"آسمان اگر امیر المؤمنین مستعصم باللہ کی بادشاہی کے زوال پر زمین پر خون برسائے تو اس کے لیے عین حق ہے۔"

ویسے مستعصم باللہ آخری عباسی خلیفہ نہیں تھا۔ ۱۲۶۱ء میں مصر و شام اور حجاز کے مملوک حکمران رکن الدین الظاہر بیبرس نے قاہرہ میں ایک عباسی شہزادے احمد مستنصر باللہ کو تختِ خلافت پر بٹھایا تھا۔ قاہرہ کی یہ عباسی خلافت ۱۵۱۷ء تک چلی حتیٰ کہ عثمانی ترک سلطان سلیم اوّل کے ہاتھوں فتح مصر کے بعد خلافت قسطنطنیہ میں عثمانیوں کو منتقل ہو گئی۔ متوکل علی اللہ قاہرہ میں آخری عباسی خلیفہ تھا۔

⑩ مقتدا منصور 'ایکسپریس' میں 'صدائے جرس' کے عنوان سے کالم لکھتے ہیں، وہ فکری طور پر سیکولر اور سوشلسٹ ہیں۔ ۴ مئی ۲۰۱۵ء کے کالم میں وہ لکھتے ہیں:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"آج پاکستان جس آگ میں جھلس رہا ہے، اس میں پہلی چنگاری ملک کے پہلے سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی نے سلگائی تھی جب انھوں نے ایک طرف علامہ شبیر احمد عثمانی کو قرارداد مقاصد دستور ساز اسمبلی میں پیش کرنے پر اکسایا تاکہ ملک میں تھیوکریسی کی راہ ہموار کی جاسکے۔"

گویا موصوف کو ساری خرابیاں قراردادِ مقاصد (مارچ ۱۹۴۹ء) کی منظوری میں نظر آتی ہیں جس میں نفاذِ اسلام کے نام پر بنے ہوئے اس ملک میں اسلامی اُصولوں کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا عہد کیا گیا تھا۔ منصور صاحب کو پرویز مشرف نظر نہیں آتا جس نے امریکہ کی صلیبی جنگ میں حصّہ بٹا کر ملک کو امریکیوں کی چراگاہ بنادیا اور وطن عزیز اس پرویزی پالیسی کے منحوس اثرات سے ابھی تک باہر نہیں آسکا۔ انھیں غصّہ ہے تو اس بات پر کہ ملک میں چند سطحی قسم کے نفاذِ اسلام کے اقدامات بھی کیوں کیے گئے ہیں، مثلاً امتناعِ شراب، قانون تحفظِ ناموس رسالت، قانون نفاذ حدود اور قانون تحفظِ ختم نبوت جس کی رو سے قادیانی غیر مسلم قرار پائے۔ وہ ان اقدامات کو تھیوکریسی (ملاؤں کی حکومت) کی راہ ہموار کرنا قرار دے رہے ہیں۔ حالانکہ خود بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے بارہا ملک میں اسلامی اُصولوں اور قرآنی نظام کے نفاذ کی بات کی تھی۔

اس کے باوجود سیکولر اور اشتراکی (کمیونسٹ) لابی کے پیٹ میں قراردادِ مقاصد کی مخالفت کے مروڑ اُٹھتے رہتے ہیں۔ اس گروہ نے ۱۹۵۱ء میں پاکستان میں کمیونسٹ انقلاب برپا کرنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ بعد میں یہ لوگ فوجی آمریتوں میں پھولتے پھلتے رہے۔ شروع میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت میں بھی اشتراکی عناصر پوری طرح دخیل تھے مگر بھٹو صاحب جلد ان کے دام سے نکل گئے اور انھی کے عہد میں 'تحفظ ختم نبوت بل' پاس ہوا۔

مقتدا منصور نے یہ لکھ کر دل کے پھپھولے پھوڑے ہیں کہ "بھٹو کے دور میں ریاست کو ان معاملات میں اُلجھا دیا گیا جس سے عموماً اس کا سروکار نہیں ہوتا۔" گویا وہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ بھٹو حکومت کو تحفظِ ختم نبوت اور امتناعِ شراب جیسے اقدامات نہیں کرنے چاہئیں تھے اور یہاں سوشلزم کے نفاذ ہی پر کاربند رہنا چاہیے تھا۔

منصور میاں تاریخی گمراہیاں پھیلانے والے ڈاکٹر مبارک علی کی پرزور حمایت کرتے ہوئے ان کے الفاظ لکھتے ہیں: "جو معاشرے فکری کثرتیت کا راستہ چھوڑ دیتے ہیں، وہ تنزل کا شکار ہو کر بدترین تباہی سے دوچار ہو جاتے ہیں۔" اس 'تنزل' کی مثال میں اُنھوں نے سبین محمود کا ذکر کیا ہے جس نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے بقول "ایک ادارہ T2F قائم کر کے خرد افروزی اور عقلیت پسندی کو پروان چڑھانے کی کوشش کی تھی۔" ظاہر ہے 'فکری کثرتیت' سے اُنکی مراد یہ ہے کہ سیکولرزم، ڈارونزم، سوشلزم، کمیونزم جیسے گمراہ کن مغربی نظریات کی جگالی کرنا تو عین مطلوب ہے مگر کوئی یہاں اسلامی نظام کے نفاذ کی بات نہ کرے۔ بھلا یہ 'خرد افروزی' اور 'عقلیت پسندی' کس چڑیا کا نام ہے؟ یہ تو وہی اہلِ مغرب کے پروردہ پرویزی ٹولے کی مزعومہ روشن خیالی Enlightenment اور عقل پرستی Rationalism کی فکری گمراہیاں ہیں۔ سوے اتفاق سے اس گمراہ ٹولے کے دونوں امام پرویز (غلام احمد پرویز اور پرویز مشرف) ہیں۔ انھی غیر اسلامی نظریات کو اپنانے والے اربابِ اختیار ہی نے تو ملک کو تباہی کے راستے پر ڈالا ہے مگر بایں ہمہ اکیسویں صدی کا 'منصور' بڑی ڈھٹائی سے اسلامی نظریات اور اسلامی نظام کو تنزل اور تباہی سے منسلک کر کے ڈنکے کی چوٹ اس مسلم معاشرے میں ذہنی گمراہی پھیلا رہا ہے۔

اسے "اس خطے کی صدیوں پر محیط صوفی روایات کو نئی نسل میں متعارف کرانے کی کوشش" کرنے والی این جی او کی سربراہ سبین محمود کے قتل کا تو بہت دُکھ ہے (ایسے قتل کا ہمیں بھی دُکھ ہے) مگر وہ جو امریکی ڈرون حملوں میں اب تک ہزاروں افراد شہید کیے گئے ہیں یا ڈاکٹر عافیہ صدیقی کو امریکہ میں جرم بے گناہی کی ۸۶ سال قید میں رکھا گیا ہے، اس پر اس نام نہاد منصور کو کوئی قلق نہیں، اس لیے کہ کمیونسٹوں کے امام سوویت روس کی موت کے بعد اشتراکیوں نے بظاہر سیکولر مگر دراصل کٹر صلیبی امریکہ و یورپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔

⑪ ایاز امیر صاحب کو مے خواری سے شغف ہے اور وہ اپنے کالم میں اس کا برملا اظہار بھی کر چکے ہیں۔ اس بُری عادت کے فخریہ اظہار کے باعث ہی وہ ۲۰۱۳ء میں قومی اسمبلی کا الیکشن نہیں لڑ سکے۔ اپنا ایک کالم (روزنامہ 'جنگ' ۶ مئی) اُنھوں نے سلطنتِ مغلیہ کے بانی بابر کی شراب نوشی پر سیاہ کیا ہے جس نے جنگ کنواہہ (۱۵۲۸ء) میں ہندو رانا سانگا کو شکست دینے سے پہلے مے نوشی سے توبہ کر لی تھی، مگر ایازِ چکوال نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا۔ اسی کالم میں اُنھوں نے قراردادِ مقاصد کی نفی کرنے کا یہ انداز اپنایا ہے کہ "کیا خاندانِ غلاماں یا تیموری بادشاہوں نے بھی کوئی قراردادِ پاکستان منظور کی تھی۔" محترم عبداللہ طارق سہیل کے الفاظ میں 'باٹلی کالم نویس' کو تکلیف اس بات کی ہے کہ اگر قراردادِ مقاصد کے مطابق اسلامی جمہوریہ پاکستان میں تمام اسلامی احکامات صحیح معنوں میں نافذ ہو گئے تو پھر ان کے یہ جام و مینا کے بے ہودہ شغل کیسے چلیں گے۔

© rasailojaraid.com